معاملۂ شرکت کی حقیقت اور شرعی حیثیت

مولانا محمد طاسین، صدر مجلس علمی، کراچی

زیرِ نظر مضمون میں میرا مقصد ایک تو یہ بیان اور واضح کرنا ہے کہ معاملۂ شرکت کی شرعی حقیقت کیا ہے' بالفاظِ دیگر اس پر روشنی ڈالنا ہے کہ شریعت اور فقہ اسلامی کی اصطلاح میں معاملۂ شرکت کا کیا مفہوم و مطلب ہے؟ اس کے بعد اس کی شرعی حیثیت کو اجاگر کرنا ہے کہ یہ جائز ہے تو قرآن وحدیث میں اس کے جواز کے دلائل کیا ہیں' نیز پھر کچھ اس بارے میں بھی عرض کرنا ہے کہ عہدِ حاضر اور موجودہ حالات میں اس معاملہ کی اہمیت کتنی اور ضرورت کس قدر ہے۔

شرکت اور مضاربت کے مابین فرق

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ کہ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ کوئی بھی معاشی کاروبار خواہ تجارت سے متعلق ہو یا صنعت اور زراعت سے متعلق' اس کے لئے دو چیزوں کا وجود ضروری ہوتا ہے۔ ایک کسی نہ کسی شکل میں سرمائے کا اور دوسرے انسانی کام و عمل اور سعی و محنت کا' خواہ دماغی ہو یا جسمانی' لہٰذا دو یا دو سے زائد افراد کے درمیان اشتراک کے ساتھ کوئی معاشی کاروبار کرنے کی صرف دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کاروبار میں ہر شریک کا سرمایہ بھی ہو اور کام کار بھی اور دوسری شکل یہ کہ ایک شریک کا صرف سرمایہ ہو اور دوسرے کا محض کام و عمل' ان میں سے پہلی شکل کا نام فقہ و شریعت کی اصطلاح میں شرکت اور دوسری شکل کا نام مضاربت اور قِراض ہے' اور یہ دونوں معاملے شرعًا جائز ہیں۔

شرکت اور مضاربت کے درمیان فرق و اختلاف کی ایک وجہ تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی یعنی شرکت میں ضروری ہوتا ہے کہ ہر فریق اور ہر شریک کا کاروبار میں سرمایہ بھی ہو اور کام و عمل بھی' جبکہ مضاربت میں ایک شریک کا محض سرمایہ اور دوسرے کا صرف

کام و عمل ہونا ضروری ہوتا ہے' اور دوسری ایک نمایاں وجہ فرق و اختلاف کی یہ ہے کہ شرکت کے معاملہ میں سب شرکاء نفع کی صورت میں نفع میں اور نقصان کی صورت میں نقصان میں اس تناسب سے شریک ہوتے ہیں جو معاملہ شروع کرتے وقت ان کے مابین طے پاتا ہے' جب کہ معاملہ مضاربت میں بصورتِ نفع سب شرکاء اس تناسب سے حصہ دار ہوتے ہیں جو ابتداء میں ان کے درمیان طے پاتا ہے لیکن نقصان و خسارے کی صورت میں مالی نقصان پورے کا پورا مال والے فریق کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو رب المال کہلاتا ہے' کام و محنت کرنے والا فریق جس کو عامل مضارب کہا جاتا ہے مالی نقصان میں بالکل شریک نہیں ہوتا' لہٰذا اس سے مالی نقصان کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔

سطورِ بالا میں جو عرض کیا گیا ہے اس کے مطابق معاملۂ شرکت کی اصطلاحی تعریف یہ ہوتی ہے کہ معاملۂ شرکت وہ معاشی معاملہ ہے جس میں شریک ہر فریق کا کسی نہ کسی شکل میں سرمایہ بھی موجود ہونا ضروری ہوتا ہے اور معاشی کام و عمل بھی ضروری ہوتا ہے اور نفع اور نقصان دونوں کی صورت میں سب شرکاء اس میں شریک اور حصہ دار ہوتے ہیں۔

معاملۂ شرکت کی اقسام

معاملۂ شرکت کی فقہ حنفی میں ایک پہلو سے تین قسمیں بیان کی گئی ہیں جن کے الگ الگ نام ہیں۔ ایک کا نام ہے شرکۃ الاموال جس میں ہر شریک کا زر و نقدی کی شکل میں سرمایہ بھی موجود ہوتا اور خرید و فروخت کی شکل میں تجارتی کام و عمل بھی ضرور پایا جاتا ہے۔ شرکت کی یہ شکل کثیر الوقوع ہے۔ دوسری قسم کا نام ہے شرکۃ الوجوہ' یہ شرکت کا وہ معاملہ ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ اشخاص خرید و فروخت کی شکل میں تجارت کا کاروبار کرتے ہیں لیکن ان کے پاس اپنا ذاتی سرمایہ نہیں ہوتا جس سے وہ مختلف اشیاء خریدتے اور بیچتے ہوں بلکہ اپنی وجاہت اور اچھی ساکھ کی بنا پر وہ دوسروں سے تجارتی اشیاء قرض پر لے کر بیچتے اور نفع کماتے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس شرکت میں بھی ہر شریک کا قرض کے طور پر حاصل کیا ہوا سرمایہ بھی موجود ہوتا ہے اور خرید و فروخت کی شکل میں ہر شریک کا کام و عمل بھی موجود ہوتا ہے۔ شرکت کی تیسری قسم کا نام شرکۃ الصنائع ہے' نیز اس کو شرکۃ الابدان' شرکۃ الاعمال اور شرکۃ التقبل بھی کہا جاتا ہے۔ شرکت کے اس

معاملہ میں دو یا دو سے زائد ایسے اشخاص شریک ہوتے ہیں جن کا کسی صنعت و حرفت سے تعلق ہوتا ہے جیسے لوہار' بڑھئی' درزی' دھوبی وغیرہ۔ وہ آپس میں یہ طے کرتے ہیں کہ ہم اپنے پیشے کا کام مل جل کر باہمی اشتراک سے کریں گے' مصنوعات تیار کریں گے اور بیچیں گے' نفع ہوگا تو اس تناسب سے آپس میں تقسیم کرلیں گے اور اگر نقصان ہوگیا تو اس میں بھی شریک اور حصہ دار ہوں گے۔ اس شرکت میں بھی اوزار' مشینوں' خام مال اور ایندھن کی شکل میں سب شرکاء کا سرمایہ بھی ہوتا ہے اور پیشہ ورانہ کام و عمل بھی' کیونکہ ہر صنعت و حرفت کے لئے مذکورہ دونوں چیزوں کا وجود لازمی و ضروری ہوتا ہے۔ غرضیکہ معاملۂ شرکت کی ہر قسم اور ہر شکل میں شرکاء کے سرمائے کے ساتھ ان کا کام و عمل موجود ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔

فقہاءِ کرام نے ایک دوسرے پہلو سے معاملۂ شرکت کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر اس میں یہ طے ہو کہ تمام شرکاء کا سرمایہ اور کام مساوی اور بالکل برابر ہوگا' جتنا سرمایہ اور عمل ایک شریک کا ہوگا اتنا ہی ہر دوسرے شریک کا بھی ہوگا تو اس شرکت کا نام فقہ کی اصطلاح میں' شرکۃ المفاوضہ ہے' اور اگر سرمائے اور کام میں مساوات وبرابری کی بجائے تفاوت اور کمی بیشی طے ہو یعنی یہ کہ بعض شرکاء کا سرمایہ اور کام زیادہ اور بعض کا کم ہوگا اور اس کے لحاظ سے نفع اور نقصان میں حصہ داری بھی کمی بیشی کے ساتھ ہوگی تو شرکت کی اس قسم اور شکل کا نام شرکۃ العنان ہے۔ شرکۃ المفاوضہ اور شرکۃ العنان کے مابین فرق کی ایک وجہ فقہاءِ کرام نے یہ لکھی ہے کہ شرکۃ المفاوضہ میں ہر شریک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے اور کفیل و ضامن بھی' بخلاف شرکۃ العنان کے کہ اس میں ہر شریک دوسرے کا وکیل تو ہوتا ہے لیکن کفیل و ضامن نہیں ہوتا' چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شرکۃ المفاوضہ کے تمام شرکاء کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ آزاد' عاقل' بالغ اور سمجھ دار ہوں' جس کا مطلب ہے کہ ایک غلام' مجنون' نابالغ اور ناسمجھ اس کا شریک نہیں بن سکتا۔ جبکہ شرکۃ العنان میں یہ ضروری نہیں' چنانچہ ایک غلام اور نابالغ بھی اس کا شریک بن سکتا ہے' یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ شرکۃ المفاوضہ کے قائل ہیں دوسرے ائمہ اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ اس میں جو

مساوات ضروری ٹھہرائی گئی ہے وہ نظری طور پر ممکن سہی لیکن عملی طور پر ممکن نہیں۔ عملی طور پر جو شرکت بآسانی ممکن ہے وہ شرکۃ العنان ہے' لہٰذا جب اسلام کے حوالے سے شرکت کا ذکر ہو تو اس سے مراد شرکۃ العنان ہی ہوتی ہے جس میں شرکاء کا سرمایہ اور کام و عمل تفاوت اور کمی بیشی کے ساتھ موجود ہوا کرتا ہے اور جس کے جواز پر سب ائمہ مجتہدین کا اتفاق اور اجماع ہے۔

معاملۂ شرکت کی اصل وجہِ جواز

معاملۂ شرکت کے متعلق جو بات خاص طور پر سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ اس کی ہر قسم اور ہر شکل میں سرمائے کے ساتھ کام و محنت کا پایا جانا بھی نہایت ضروری ہے' بلکہ میں سمجھتا ہوں یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے معاملۂ شرکت بلا کسی کراہیت کے قطعی طور پر جائز اور مستحب معاملہ ہے' کیونکہ نفع کی صورت میں معاملۂ شرکت کے شرکاء کو جو نفع ملتا ہے وہ اس دماغی جسمانی کام و محنت کا ثمرہ ہوتا ہے جو ہر شریک کرتا اور انجام دیتا ہے۔ گویا معاملہ شرکت میں ہر شریک کے کام و عمل کا موجود ہونا بصورتِ نفع اس کو نفع کے ایک حصہ کا حقدار بنا دیتا ہے' لہٰذا اس میں ہر شریک اپنا جائز بلکہ واجبی حق لیتا ہے جو عدل کے عین مطابق ہوتا اور جس میں ہر شریک کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے جو کسی معاشی معاملے کی صحت کے لئے شرط کی حیثیت رکھتی ہے' بخلاف مضاربت کے کہ اس میں بصورتِ نفع مال والے فریق یعنی رب المال کو نفع کا جو حصہ ملتا ہے اس کے مقابلہ میں رب المال کی طرف سے نہ کوئی پیدا آور دماغی جسمانی محنت و کارکردگی موجود ہوتی ہے اور نہ کسی مال کی شکل میں قدر و قیمت کے لحاظ سے اس کا کوئی مساوی عوض وبدل موجود ہوتا ہے لہٰذا وہ بظاہر دوسرے کا مال بغیر عوض کے لیتا ہے۔ اور چونکہ معاوضے کے معاملہ میں دوسرے کا مال بغیر عوض کے لینا' حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ اور حضرت حسنؒ بصری کے اس قول: "**اَلبَاطِلُ هُوَ كُلُّ مَا يُؤْخَذُ مِنَ الاِنسانِ بِغَيرِ عِوَضٍ**" (باطل ہر وہ مال ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض کے لیا جائے) کے مطابق اکل بالباطل کی تعریف میں آتا ہے جس کی قرآن مجید میں صریح طور پر ممانعت ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد رب العزت ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ

تَرَاضٍ مِّنكُمْ

"اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل و ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ سوائے ایسی تجارت کے طریقہ کے جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہو"۔

متعدد مفسرین کرام نے معاملہ ربوٰ کے حرام ہونے کی وجہ بھی یہی لکھی ہے کہ اس میں ایک فریق یعنی قرض دینے والا دوسرے فریق یعنی مقروض سے قرض کے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے اس کا اس کی طرف سے کوئی عوض موجود نہیں ہوتا' گویا وہ بغیر عوض کے دوسرے کا مال لیتا اور اکل بالباطل کا مرتکب ہوتا ہے جو ممنوع اور حرام ہے۔ بنا بریں بظاہر مضاربت کو بھی جائز نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن چونکہ اس میں یہ جوطے ہوتا ہے کہ نقصان کی صورت میں پورے کا پورا نقصان رب المال یعنی مال والا فریق برداشت کرے گا' عامل مضارب یعنی کام کرنے والا فریق مالی نقصان میں بالکل شریک نہ ہوگا' لہٰذا اس کی وجہ سے معاملۂ مضاربت جائز ہوجاتا ہے' یعنی اس میں رب المال کی طرف سے نقصان کی صورت میں پورا نقصان برداشت کرنے کی جو ضمانت اور ذمہ داری ہوتی ہے وہ نفع کی صورت میں اس کے لئے نفع کا ایک حصہ لینے کا جواز پیدا کردیتی ہے۔ مطلب یہ کہ اگرچہ رب المال کی طرف سے نفع کے عوض کوئی کام و عمل اور کوئی مال موجود نہیں ہوتا لیکن اس کی طرف سے نقصان برداشت کرنے کی جو ذمہ داری ہوتی ہے وہ نفع لینے کا عوض بن جاتی اور اس کی وجہ سے معاملۂ مضاربت جائز قرار پاتا ہے' لیکن چونکہ نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری کوئی ایسی محسوس اور واقعی حقیقت نہیں ہوتی جیسے کام و عمل اور کوئی مادی مال محسوس اور واقعی حقیقت ہوتا ہے لہٰذا نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری سے رب المال کے لئے نفع لینے کا جو جواز پیدا ہوتا ہے وہ اس درجہ کا جواز نہیں ہوتا جس درجہ کا جواز کام و عمل کی وجہ سے عامل مضارب کے لئے نفع لینے کا ہوتا ہے۔ پہلا جواز مکروہ کا درجہ اور دوسرا جواز استحباب و مستحب کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک حدیث نبویؐ میں فرمایا گیا ہے کہ سب سے بہتر اور پاکیزہ روزی جو انسان کھاتا ہے وہ ہے جو وہ اپنے ہاتھ سے خود محنت و مشقت کر کے کماتا ہے۔ مضاربت پر تفصیلی بحث دیکھنی ہو تو میرے مضمون "مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (ماہنامہ

حکمت قرآن لاہور' نومبر ۸۴ء تا فروری ۸۵ء)

بہر حال اصل بات جو میں عرض کر رہا تھا وہ یہ کہ شرکت کے معاملہ میں بصورتِ منافع ' شرکاء کو جو نفع ملتا ہے چونکہ اس کے عوض ہر شریک کا کام و عمل بھی موجود ہوتا اور بصورتِ نقصان' نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری بھی موجود ہوتی ہے لہٰذا وہ بلا کراہیت کے شرعاً ایک بالکل اور قطعی طور پر جائز اور مستحب معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا کرنا ثابت ہے' جبکہ مضاربت کا کرنا ثابت نہیں' مستند روایات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اعلانِ نبوت سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے جو کاروباری معاملہ کیا تھا یعنی ان کے کاروانِ تجارت کے ساتھ شام وغیرہ جا کر خرید و فروخت کا جو کام کیا تھا وہ نفع کے ایک حصہ پر نہ تھا بلکہ متعین اجرت کے عوض تھا جس کی تفصیل بعض روایات میں دو جوان اونٹ اور بعض میں چار اونٹ بیان ہوئی ہے۔ کسی مستند روایت میں نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام مضاربت کے طور پر کیا تھا' البتہ ایسی روایت بلکہ صحیح حدیث ضرور موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت سے پہلے شرکت کے طور پر کاروبار کیا۔ یہ روایت آگے آرہی ہے۔

مشروعیت کے منصوص دلائل

اب میں قرآن وحدیث کی کچھ وہ نصوص بیان کرتا ہوں جو معاملۂ شرکت کی مشروعیت اور اس کے جواز پر دلالت کرتی ہیں اور جو فقہاءِ کرام نے کتاب الشرکۃ میں نقل اور ذکر کی ہیں۔ سورۃ الکہف کی آیت ہے:

اَمَّا السَّفِیْنَۃُ فَکَانَتْ لِمَسٰکِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ (الایۃ)

یعنی وہ کشتی جس میں سوراخ کر کے عیب دار بنادیا گیا مسکین لوگوں کی تھی جس کے ساتھ وہ دریا میں اشتراک سے کشتی رانی کا کام کرتے اور روزی کماتے تھے۔

دوسری آیت سورۃ صٓ کی یہ آیت ہے:

وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِیْلٌ مَّا هُمْ (الآیۃ)

"اور بلاشبہ اشتراک کے ساتھ کام کرنے والے شرکاء زیادہ تر ایسے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی حق تلفی کرتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جو مشرف بہ ایمان ہونے کے ساتھ نیک عمل بجالاتے ہیں اور جو بہت ہی کم ہیں"۔

معاملۂ شرکت کے ثبوت اور جواز میں سورۃ القلم کی ان آیات کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے جن کے اندر باغ اور کھیت والوں کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس قصہ کے اندر یہ جو ذکر ہے کہ وہ لوگ مل جل کر باہمی اشتراک سے اپنے باغ اور کھیت کے مختلف کام انجام دیتے اور اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھاتے تھے اس سے زراعتی کاروبار میں شرکت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ پورا قصہ یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں، جس کو جاننا ہو وہ قرآن مجید کی مذکورہ سورت اور اس کی تفاسیر کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

معاملۂ شرکت کے متعلق جو احادیث ملتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) **عن ابی هُریرۃَ رَضِیَ اللّٰهُ عنه قالَ قالَ رسولُ اللّٰهِ صلی اللّٰهُ علیهِ وسلَّم اِنَّ اللّٰهَ یقُولُ انا ثَالِثُ الشَّرِیکَینِ ما لَم یَخُنْ اَحدُهُما صَاحِبَه فَاِذا خَانَه خَرجتُ من بَینِهما (سنن ابی داؤد)**

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ شرکت کے ساتھ کام کرنے والے دو شریکوں کے ساتھ میں تیسرا رہتا ہوں جبتک ان میں سے ایک دوسرے کی خیانت نہیں کرتا، پس جب ان میں سے کوئی خیانت کرتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں"۔

اس کی شرح میں محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ یہ حدیث قدسی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملۂ شرکت کے شرکاء جب تک دیانتداری کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں اور کوئی خیانت کا مرتکب نہیں ہوتا تو اللہ ان کے کاروبار کی حفاظت کرتا، اس کو بڑھاتا اور اس میں برکت فرماتا ہے، اور جب ان میں سے کوئی خیانت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کاروبار کو ترقی اور برکت سے محروم کردیتا ہے۔ گویا اس حدیث مبارک میں جو

تعلیم ہے وہ یہ کہ کسی کاروبار میں شرکت کے تمام شرکاء کو ہمیشہ دیانت اختیار کرنا اور خیانت سے ضرور بچنا چاہئے!

(۲) عنِ السّائبِ بنِ ابی السّائبِ رَضِی اللّٰہُ عنہُ انّہٗ قالَ لِلنّبیّ صلّی اللّٰہُ علیہِ وسلّم کُنتَ شریکی فِی الجاھِلیۃِ فکنتَ خیرَ شریکٍ لاتُدُ ارینی ولاَ تُمارِینی۔ رواہ ابوداؤد و ابنُ ماجۃَ و لفظُہٗ: کنتَ شریکی ونِعمَ الشریکُ کنتَ لاتُدُاری ولا تُماری۔

"حضرت سائب ابن ابی سائبؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا: آپ عہدِ اسلام سے پہلے عہدِ جاہلیت میں میرے کاروباری شریک تھے' پس آپ بہترین شریک تھے' نہ کبھی آپ نے منع کیااور نہ کبھی مجھ سے جھگڑا کیا۔ یہ روایت ابوداؤد کی ہے اور سنن ابن ماجہ میں اس کے جو الفاظ ہیں ان کا ترجمہ ہے: آپ میرے شریک کار تھے اور نہایت عمدہ شریک کار' نہ کبھی آپ نے روکا اور نہ تکرار اور مباحثہ کیا"

واضح رہے کہ اسی حدیث کے بعض دوسری کتبِ حدیث میں جو الفاظ ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سائب کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تم عہدِ جاہلیت میں میرے کاروباری شریک تھے' اور بہت اچھے شریک تھے نہ تم نے کبھی مجھے کسی کام سے منع کیا اور نہ جھگڑا اور تکرار کیا۔ بہرحال اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اعلانِ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس شرکت کے ساتھ کاروبار کیا جو اس کے جواز کی دلیل ہے۔

(۳) عنْ ابی المنھالِ اَنَّ زیدَ بنَ الارقَمَ والبراءَ بنَ عازِبٍ کانا شریکینِ فاشتَریا فِضّۃً بِنقدٍ ونَسیئۃٍ فبلغَ النبیَّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم فامَرَ ھُما انّ ماکانَ بِنقدٍ فاجیزُوہُ وَماکانَ بِنَسِیئۃٍ فرُدوہُ۔ (مسند احمد و صحیح البخاری)

"حضرت ابوالمنہالؒ سے مروی ہے کہ حضرت زیدؓ بن ارقم اور حضرت براءؓ بن عازب کاروبار میں ایک دوسرے کے شریک تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے چاندی خریدی' کچھ نقد کے عوض اور کچھ ادھار کے طور پر۔ یہ معاملہ جب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ جو چاندی نقد کے عوض خریدی ہے درست ہے' اسے جائز سمجھو اور جو ادھار خریدی ہے اس کو رد اور واپس کردو"۔

مذکورہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ معاملۂ شرکت اسلام میں ایک مشروع اور جائز معاملہ ہے۔

معاملۂ شرکت اور موجودہ کارخانہ داری نظام

جہاں تک معاملۂ شرکت کی اہمیت وضرورت کا تعلق ہے ویسے تو وہ ہمیشہ سے تھی لیکن عہدِ حاضر اور موجودہ زمانے میں وہ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے موجودہ دور میں بڑے پیمانے کے معاشی کاروبار کا رواج برابر بڑھ گیا بلکہ ضروری ہو گیا ہے' جس کے لئے بڑے سرمائے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور کام ومحنت کرنے والے کثیر التعداد افراد کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ بڑے پیمانے کے معاشی کاروبار کی مثال مختلف قسم کے کارخانے' مل' صنعتی مراکز' زرعی اور مویشی فارم' شعبہ جاتی سپر مارکیٹیں' بینک اور بیمہ کمپنیاں' ٹرانسپورٹ اور نشرواشاعت کے ادارے ہیں۔موجودہ دور میں ان کی اہمیت اور ضرورت کا کون انکار کرسکتا ہے۔ موجودہ تمدنی ڈھانچے میں مذکورہ چیزوں کی حیثیت عناصر ترکیبی کی ہے' اور چونکہ بڑے پیمانے کے معاشی کاروبار شرکت ہی کی بنیاد پر قائم ہو سکتے اور جاری رہ سکتے ہیں لہٰذا اس سے معاملۂ شرکت کی اہمیت اور ضرورت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہاں واضح کردینا ضروری ہے کہ بڑے پیمانے کے مذکورہ معاشی کاروبار جس شکل میں آج قائم ہیں اور چل رہے ہیں یہ شکل نظامِ سرمایہ داری کے مطابق ہے' اسلام کے مطابق نہیں۔ اسلام کے مطابق بڑے پیمانے کے معاشی کاروبار کی اسلامی شکل صرف وہ ہوسکتی ہے جس میں سب شرکاء کا سرمائے کے ساتھ کام و عمل بھی موجود ہو۔ اسلام کے نزدیک ایک مل اور کارخانے کی صحیح شکل صرف وہ ہوگی جس میں کارخانے اور مل کے اندر کام کرنے والے سب افراد کا' کمی بیشی کے ساتھ' سرمایہ بھی موجود ہو اور ان کے درمیان منافع کی تقسیم کام وعمل کی نوعیت اور مقدار کے مطابق طے پائے' جیسی اور

جتنی کسی کی محنت اور کارکردگی ہو اس کے مطابق پیداوار میں سے اس کا حصہ مقرر ہو۔ کارخانے میں کام کرنے والوں میں سے اگر کسی کے پاس شرکت کے لئے فاضل مال نہ ہو تو دوسرے لوگ اس کو قرضِ حسنہ کے طور پر مال دے کر شریک بنا سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے بیت المال سے بھی ایسے افراد کو قرضِ حسن کے طور پر مال دے کر کاروبار میں شریک بنایا جاسکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس کاروبار میں کسی کا اپنا سرمایہ شامل ہو وہ اس میں دل لگا کر پوری مستعدی اور چستی کے ساتھ اپنا سمجھتے ہوئے کام کرتا ہے اور اس کے اندر عزتِ نفس اور خودداری کی شان بھی موجود رہتی ہے، جو اس صورت میں موجود نہیں ہوتی جب وہ دوسرے کے لئے اجیر کی حیثیت سے اجرت پر کام کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرے کے لئے کام کرنے میں آدمی عام طور پر وہ مستعدی اور سرگرمی نہیں دکھاتا جو اپنے لئے کام کرنے میں دکھاتا ہے کیونکہ اپنا کام کرنے میں اس کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس سے حاصل ہونے والا منافع تمام تر اس کو ملے گا، جبکہ دوسرے کے لئے اجرت پر کام کرنے میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ حاصل ہونے والے منافع کا اس کو صرف ایک حصہ ملے گا لہٰذا اس میں وہ زیادہ تندہی اور چستی نہیں دکھاتا جو اپنے لئے کام کرنے میں دکھاتا ہے اور یہ ایک بالکل فطری چیز ہے۔

اوپر میں نے یہ جو عرض کیا ہے اسلامی شرکت کی بنیاد پر قائم کئے گئے کارخانے میں ضروری ہوگا کہ کارخانہ سے حاصل ہونے والے منافع کی تقسیم، کام کرنے والے شرکاء کے درمیان کام کی نوعیت اور مقدار کے مطابق عمل میں آئے، جیسا اور جتنا کسی شریک کا کام کار ہو اس کے مطابق منافع میں سے اس کا حصہ ہو، اس وجہ سے کہ اسلام اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اپنی افادیت کے لحاظ سے تمام انسانی اعمال واشغال یکساں وبرابر نہیں بلکہ ان کے درمیان فرق وتفاوت ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان کے معاوضوں کے درمیان بھی فرق وتفاوت ہو، گویا یہ ایک ایسا اصول ہے جو عدل وانصاف اور عقل وفطرت کے عین مطابق ہے اور جس کی صحت وصداقت پر پوری انسانیت کا اتفاق ہے۔ ہر انسانی معاشرے میں مختلف کاموں کے معاوضوں کے تعین میں اس اصول کو ملحوظ ومدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ پھر یہ اصول اس لحاظ سے اہم بھی ہے کہ اس پر صحیح طور پر عمل کیا جائے تو اس سے ملکی پیداوار اور قومی دولت میں بیحد اضافہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ جب

کام کرنے والے یہ دیکھتے ہیں کہ جس کا کام نوعیت کے لحاظ سے بہتر اور مقدار کے لحاظ سے زیادہ ہوتا ہے اس کو معاوضہ زیادہ ملتا ہے تو ان کے اندر زیادہ معاوضے کی خاطر اپنے کام کو بہتر اور زیادہ کرنے کا جذبۂ مسابقت ابھرتا ہے اور وہ بہتر اور زیادہ کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں' اور اس کا لازمی نتیجہ ملکی پیداوار میں بہتری اور زیادتی کی صورت میں نکلنا ایک قدرتی امر ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

دراصل اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس نے اپنی دوسری تمام تعلیمات کی طرح معاشی واقتصادی تعلیمات میں بھی انسان کے فطری تقاضوں اور اس کی دنیوی و اخروی فلاح وبہبود کو پوری طرح ملحوظ و مدِ نظر رکھا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اسلامی معاشی اصول و تصورات کو غیر اسلامی معاشی اصول و تصورات سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی اصول و تصورات میں نہ انسانی فطرت کے جملہ تقاضوں اور نہ انسانی فلاح وبہبود کے ہمہ جہت اور جامع تصور کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔

مثلاً نظامِ سرمایہ داری میں کارخانہ داری کی جو شکل ہوتی ہے وہ یہ کہ جو لوگ کارخانہ کے اندر مختلف قسم کے کام کرتے ہیں ان کی حیثیت کارخانہ دار کے نوکروں اور ملازموں کی ہوتی ہے' ان کو ان کے کاموں کا معاوضہ تنخواہوں اور اجرتوں کی شکل میں ملتا ہے جو کارخانے کی انتظامیہ طے کرتی ہے اور اس طے کرنے میں وہ ان کی معاشی مجبوریوں سے پورا فائدہ اٹھاتی ہے۔ بہرحال کارخانے کے سرمائے میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا' اور اگر کسی کا کچھ حصہ ہوتا بھی ہے تو وہ اپنے کام کا ضرور معاوضہ لیتا ہے' نفع کے کسی حصہ پر کام نہیں کرتا جیسا کہ معاملۂ شرکت میں ہوتا ہے۔ کارخانہ دار کارخانے کی سالانہ آمدنی میں سے پہلے اپنے وہ جملہ اخراجات وصول کرتا ہے جو اس نے اپنے پاس سے کئے ہوتے ہیں حتی کہ چلنے اور استعمال ہونے سے مشینوں کی قیمتوں میں جو کمی واقع ہوتی ہے یعنی گھسنے اور پرانے ہونے سے' اس کا بدل بھی ضرور وصول کرتا ہے۔ جو اخراجات وہ وصول کرتا ہے ان میں سے وہ سب اخراجات ہوتے ہیں جو کارخانہ میں استعمال ہونے والے خام مال' بجلی' گیس' پانی' کیمیاوی اشیاء اور تنخواہوں و اجرتوں وغیرہ پر وہ اپنی جیب سے کرتا ہے۔ اس کے بعد جو بچتا ہے اس میں سے کچھ ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جنہوں نے کارخانے کے کچھ حصص خرید رکھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس میں سے گورنمنٹ کے

ٹیکس وغیرہ بھی منہا کئے جاتے ہیں۔ باقی جو منافع رہ جاتا ہے وہ سارا کارخانہ دار کے ذاتی کھاتے میں جمع ہوتا ہے۔ اس کو معاشیات کی اصطلاح میں سرپلس ویلیو اور قدرِ زائد کہا جاتا ہے اور اس کا حق دار کارخانہ دار کو سمجھا جاتا ہے اور اس کے ذریعے اس کی دولت میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے اور وہ ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں اور کروڑوں سے اربوں پتی بنتا چلا جاتا ہے' جبکہ اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کی مالی اور معاشی حالت تقریباً ویسی ہی رہتی ہے اور اس میں کوئی خاص و نمایاں بہتری اور ترقی نہیں ہوتی جن کی دماغی و جسمانی محنت ومشقت سے کارخانے کی پوری پیداوار وجود میں آتی ہے' کیونکہ کارخانہ دار ان کو تنخواہ اور اجرت کے طور پر صرف اس قدر دیتا ہے جس سے ان کی قوتِ کارکردگی برقرار رہے اور پیداوار میں کمی واقع نہ ہو اور اس کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ کارخانہ دار کام محنت کرنے والوں کی تنخواہیں اور اجرتیں مقرر کرنے میں عموماً ان کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ کارخانہ کی آمدنی میں سے دوسروں کو کم سے کم دے کر باقی سب اپنے پاس رکھے اور اپنے تمول میں اضافہ کرتا رہے۔ اور یہ چیز صرف مل وکارخانے ہی میں نہیں بلکہ نظامِ سرمایہ داری کے ہر کاروباری ادارے میں یہی ہوتا ہے کہ سرمایہ دار اپنے سرمائے کے ساتھ دوسروں سے کام محنت کراتا اور اس کے پھل میں سے ان کو کم سے کم دے کر باقی خود لے لیتا ہے گویا وہ عموماً محنت کش کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا اور اس کا استحصال کرتا رہتا ہے۔

بہرحال نظامِ سرمایہ داری کی یہ لازمی خاصیت اور اٹل فطرت ہے کہ اس سے معاشرے میں بھیانک قسم کا غیر فطری معاشی نشیب وفراز اور عدم توازن ضرور پیدا ہوتا ہے جس کے بطن سے طرح طرح کی سماجی برائیاں اور اجتماعی خرابیاں اور بدعنوانیاں جنم لیتی اور معاشرے کو عام بدامنی و بے چینی میں مبتلا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ لہٰذا یہ ظلم پر مبنی قطعی طور پر غیر فطری نظام ہے۔

یہی حال تقریباً اشتراکی معاشی نظام کا بھی ہے۔ اس میں بھی کارخانہ داری کی جو شکل ہوتی ہے وہ یہ کہ کارخانے کے اندر جو کاریگر اور مزدور مختلف کام انجام دیتے ہیں ان کو ان کا معاوضہ مقررہ تنخواہوں اور اجرتوں کی شکل میں ملتا ہے۔ کارخانے کا سرمایہ ان میں کسی کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ قومی ملکیت ہوتا ہے۔ حکومت کی مقرر کردہ انتظامیہ اپنی

نگرانی میں اس کو چلاتی اور سختی کے ساتھ اس پر کنٹرول رکھتی ہے۔ کارخانے میں جو مال تیار ہوتا اور جو پیداوار وجود میں آتی ہے اس پر حکومت کا قبضہ و تسلط ہوتا ہے اور وہ اپنی اجتماعی پالیسی کے مطابق اس میں جو چاہتی تصرف کرتی ہے۔ بہرحال کارخانے کی مجموعی پیداوار میں سے جو اشتراکی نظریہ کے مطابق صرف اس محنت کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتی ہے جو کارخانہ کے اندر کاریگر اور مزدور کرتے ہیں' کام محنت کرنے والوں کو محض ایک حصہ ملتا ہے' باقی سب حکومت کے کھاتے اور قومی خزانے میں چلا جاتا ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ نظام میں کارخانے کے مالک سرمایہ دار کا جو رول اور کردار ہوتا ہے اشتراکی نظام میں تقریباً وہی رول اور کردار حکومت کا ہوتا ہے' دونوں میں محنت کش کو اپنی محنت کا پورا اور صحیح صلہ اور بدلہ نہیں ملتا اور دونوں نظاموں میں اس کی حق تلفی ہوتی ہے۔ دراصل ہر انسان فطرۃً یہ چاہتا ہے کہ جو مفید چیز اس کی سعی و محنت سے وجود میں آئے وہ اس کے انتفاع واستفادہ کے لئے مخصوص ہو' دوسرا کوئی اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر اس سے فائدہ نہ اٹھائے' خواہ وہ دوسرا کوئی بھی ہو' فرد ہو' قوم ہو یا حکومت ہو۔ اشتراکی نظام اس لحاظ سے سرمایہ دارانہ نظام سے بھی بدتر ہے کہ اس میں محنت کش پر جبر ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ نہ کوئی شکایت کر سکتا ہے اور نہ کوئی مطالبہ' جبکہ نظامِ سرمایہ داری میں محنت کش کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنی تنخواہ و اجرت بڑھانے کے لئے نہ صرف یہ کہ آواز بلند کر سکتا بلکہ احتجاج کے طور پر اسٹرائک تک کر سکتا ہے جس کا اشتراکی نظام میں خیال بھی نہیں ہو سکتا۔

اشتراکی نظام میں جبر و اکراہ کا موجود ہونا اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعض اصول و ضوابط ایسے ہیں جن پر انسان اپنی خوشی اور مرضی سے عمل نہیں کر سکتا' اس لئے کہ وہ انسانی فطرت کے خلاف ہیں' لہٰذا اس کے لئے سوائے اس کے دوسرا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ جبر و اکراہ اور سختی و تشدد کے ذریعے ان پر عمل کرائے۔ مثلاً اس کا جو فلسفۂ اجتماعیت ہے وہ فرد سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دے اور اجتماعی مفاد کی خاطر اپنے انفرادی مفاد سے دستبردار ہو جائے' بلکہ یہ سمجھے کہ اس کی اپنی کوئی مستقل انفرادی حیثیت نہیں' مستقل اور اصل حیثیت اجتماع اور اجتماعی مفاد کی ہے اور یہ کہ اجتماعی اور قومی مفاد ہی دراصل فرد کا مفاد ہے' لہٰذا فرد پر لازم

ہے کہ ہر وہ کام عمل کرے جو جماعت اور قوم کے لئے مفید ہو' خواہ اس کی ذات کے لئے مضر ہی کیوں نہ ہو اور ہر اس عمل و طرزِ عمل سے بچے اور پرہیز کرے جو قوم و جماعت کے لئے مضر و نقصان دہ ہو' خواہ اس کی ذات کے لئے کتنا ہی مفید و بہتر کیوں نہ ہو۔

اجتماعیت کا یہ اشتراکی فلسفہ اس پہلو سے بلاشبہ ایک اچھا فلسفہ ہے کہ اس میں فرد کے لئے یہ تعلیم ہے کہ وہ اپنا انفرادی اور ذاتی مفاد' اجتماعی اور قومی مفاد کے لئے قربان کردے' کیونکہ یہ تعلیم تمام ادیانِ سماویہ میں بھی خصوصًا اسلام میں بھی قطعی اور واضح طور پر موجود ہے' لیکن ایک دوسرے پہلو سے یہ فلسفہ برا اور باطل فلسفہ قرار پاتا ہے' وہ یہ کہ اس میں فرد کی مستقل حیثیت اور اس کے ذاتی مفاد کی کلیۃً نفی پائی جاتی ہے جو انسانی فطرت اور حقیقت واقعہ کے بالکل خلاف ہے' اور اس کی اصل وجہ وہ انکار ہے جو خدا' وحی و رسالت' دنیوی زندگی کے بعد اخروی زندگی اور اس میں اچھے برے اعمال کی جزاء و سزا کے متعلق نظامِ اشتراکیت میں پایا جاتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ وہ جبر و اکراہ ہے جو اشتراکی حکومت اپنے فلسفہ مذکور پر عمل کرانے کے لئے ضروری سمجھتی ہے' کیونکہ جب کسی نظامِ حیات کے پاس اپنے احکام و قوانین پر عمل کرانے کے لئے ایسے افکار و عقائد موجود نہ ہوں جو افراد کو احکام و قوانین کی پابندی پر ابھارتے اور جن کی تحریک سے وہ اپنی مرضی خوشی سے احکام و قوانین پر عمل کرتے ہیں تو پھر سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا کہ حکومتی جبر اور ڈنڈے کے زور سے افراد کو ان احکام و قوانین کی پابندی پر مجبور کیا جائے۔

اور جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ تمام ادیانِ سماویہ اور بالخصوص دینِ اسلام میں یہ تعلیم واضح طور پر موجود ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ احسان و ایثار کا سلوک و برتاؤ کیا جائے اور اپنی ذاتی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت اور اپنے ذاتی فائدہ پر اجتماع و معاشرے کے فائدہ کو ترجیح دی جائے اور یہ کہ ایسے تمام احکام و قوانین پر عمل کیا جائے جن میں بنی نوعِ انسان کی بھلائی و بہتری ہے' لیکن اس کے ساتھ اللہ کی ذات و صفات' وحی و رسالت اور آخرت کی جزاء و سزا پر اعتقاد رکھنے اور ایمان لانے کی جو تعلیم ہے وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ تمام اسلامی احکام و قوانین پر اپنی اندرونی تحریک اور مرضی خوشی سے

عمل کرے' اور چونکہ اشتراکی نظام مذکورہ مابعد الطبیعی حقیقتوں کا انکار کرتا ہے لہٰذا اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے اس کے پاس ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے یعنی جبر واکراہ کا طریقہ جو انسانی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا' لہٰذا غیر فطری طریقہ ہے۔ چنانچہ جب تک جبر قائم رہتا ایسا نظام قائم رہتا اور جب جبر ڈھیلا پڑتا اور پشت سے ہٹ جاتا ہے تو ایسا نظام تحلیل اور منتشر ہو جاتا ہے' جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے روس میں ہوا ہے۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شریعتِ اسلامی میں شرکت کا جو معاملہ ہے اس کی بنیاد پر بڑے پیمانے کے تمام معاشی کاروبار تشکیل دیئے اور چلائے جاسکتے ہیں خواہ وہ صنعت سے متعلق ہوں یا تجارت اور زراعت سے یا تعمیر و ترقی کے دوسرے شعبہ سے' اس میں افراد کی آزادی' خودداری اور عزتِ نفس بھی محفوظ رہتی ہے اور کاروبار کا پورا منافع کام محنت کرنے والوں کو ملتا ہے اور وہ سرمایہ دار کے استحصال سے بچ جاتے ہیں' کیونکہ اس میں سرپلس ویلیو اور اس کے حقدار کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب منافع کی تقسیم کام کرنے والوں کے درمیان کام کی نوعیت اور مقدار کے لحاظ سے ہو تو مسابقت کی وجہ سے ملکی پیداوار اور قومی دولت میں مسلسل اور نمایاں اضافہ بھی ہوتا ہے اور ایک ایسا معتدل و متوازن معاشی ماحول وجود میں آتا ہے جس میں سب کو معاشی خوشحالی کے ساتھ معاشی ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوتے اور سب کو پائیدار امن وامان کی خوشگوار زندگی نصیب ہوتی ہے۔

معاملۂ شرکت اور جوائنٹ سٹاک کمپنیاں

میں سمجھتا ہوں معاملۂ شرکت کی بحث نامکمل رہے گی اگر اس میں عہدِ حاضر کی جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کا تذکرہ نہ کیا جائے جن کو جدید عربی میں "شرکات" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں بڑی بنیادی اہمیت رکھتی اور جن کے ذریعے بڑے پیمانے کے تمام معاشی کاروبار مرتب اور منظم طریقہ سے چلائے جا رہے ہیں۔ پھر ان کمپنیوں کی متعدد قسمیں اور مختلف شکلیں ہیں' کچھ لمیٹڈ و محدود' اور کچھ ان لمیٹڈ و غیر محدود اسی طرح کچھ پبلک اور کچھ پرائیویٹ کہلاتی ہیں۔ ان کی پوری تفصیل دیکھنی ہو تو کمپنیوں کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ میرا مقصد یہاں ان کی

تفصیل پیش کرنا نہیں بلکہ صرف یہ بتلانا ہے کہ شرعی طور پر ان کی حیثیت کیا ہے اور کیا یہ اسلامی شرکت ومضاربت کی تعریف میں آتی ہیں یا نہیں آتیں؟

کمپنیوں کے موجودہ مروجہ نظام کا بغور تحقیقی جائزہ لیا جائے تو ایسا نظر آتا ہے کہ کمپنی کا معاملہ اپنی مجموعی شکل اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے نہ پوری طرح مضاربت کی تعریف میں آتا ہے اور نہ شرکت کی تعریف میں' بلکہ یہ اپنی نوعیت کا ایک مرکب اور پیچیدہ معاملہ ہے جس کے بعض اجزاء مضاربت سے اور بعض اجزاء ربوٰ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ کمپنی کا معاملہ بحیثیت مجموعی مضاربت کی تعریف میں اس لئے نہیں آتا کہ اس میں متعدد چیزیں ایسی ہیں جن کا معاملہ مضاربت میں نہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً مضاربت میں جن امور کا نہ ہونا ضروری ہوتا ہے ان میں سے ایک یہ کہ رب المال کسی حیثیت سے مضاربت کے کاروبار میں عمل سے شریک نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ کہ عامل مضارب' کاروبار مضاربت میں اپنا سرمایہ شامل نہیں کرسکتا ورنہ دونوں صورتوں میں وہ معاملہ' مضاربت کی بجائے کوئی دوسرا معاملہ ہوجاتا ہے جس پر مضاربت کے شرعی احکام لاگو نہیں ہوتے۔ اور جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ کمپنی کے معاملہ میں کمپنی قائم کرنے والے جو ڈائرکٹر ہوتے ہیں چونکہ وہ اس لحاظ سے عامل مضارب ہوتے ہیں کہ کمپنی کے حصص کے عوض دوسرے لوگوں سے مال لیتے اور کمپنی کے کاروبار میں لگاتے ہیں لہٰذا بحیثیت عامل مضارب ان کے لئے جائز نہیں ہوتا کہ وہ کمپنی کے کاروبار میں اپنا سرمایہ شریک کریں' حالانکہ کمپنی کے کاروبار میں ان کا بڑی مقدار میں سرمایہ شامل اور شریک ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی امرواقعہ ہے کہ بہت سے ملازمین اور کارندے جو مختلف حیثیات سے کمپنی میں کام کرتے ہیں وہ چونکہ کمپنی کے حصص کے مالک ہوتے ہیں اور کمپنی کے مجموعی سرمائے میں ان کا سرمایہ بھی شامل ہوتا ہے لہٰذا اس پہلو سے وہ رب المال ہوتے ہیں' اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مضاربت میں ضروری ہوتا ہے کہ رب المال یعنی سرمائے والا فریق' کاروبارِ مضاربت میں عملاً شریک نہ ہو۔ بنا بریں کمپنی کا معاملہ مضاربت کا معاملہ نہیں کہلا سکتا۔ علاوہ ازیں مضاربت میں ضروری ہوتا ہے کہ خرید و فروخت کی شکل میں تجارت کا جو اصل کام ہوتا ہے وہ کام عامل مضارب خود کرے' البتہ ایسے کام جن کو عام طور پر تاجر خود نہیں کیا کرتے بلکہ

مزدوری پر دوسروں سے کراتے ہیں جیسے باربرداری اور چوکیداری وغیرہ کے کام' عامل مضارب بھی ایسے کام' مضاربت کے سرمائے سے کرا سکتا ہے' لیکن جس کو تجارت کا اصل کام سمجھا اور کہا جاتا ہے اس کا کرنا اور انجام دینا عامل مضارب پر لازم و ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی عامل مضاربت تجارت کا اصل کام بھی خود نہ کرے بلکہ تنخواہ دار ملازمین سے کرائے تو یہ معاملہ مضاربت کی بجائے کوئی دوسرا معاملہ بن جاتا ہے جس کے شرعی احکام مضاربت کے شرعی احکام سے مختلف ہوتے ہیں' اور چونکہ کمپنی کے معاملہ میں کمپنی کے ڈائرکٹر حضرات جن کی حیثیت عامل مضارب کی ہوتی ہے کمپنی کے کاروبار کے اصل کام تنخواہ دار ملازموں اور نوکروں سے کراتے ہیں اور اگر کوئی کام خود بھی کرتے ہیں تو کمپنی کے سرمائے سے اس کا معقول معاوضہ لیتے ہیں لہٰذا کمپنی کا معاملہ مضاربت کے معاملہ سے مختلف ہوجاتا ہے' اسی طرح ایک اور چیز جو کمپنی کے معاملہ کو مضاربت کے معاملہ سے الگ اور جدا کردیتی ہے وہ یہ کہ مضاربت میں یہ بھی ہوتا ہے کہ نفع کی صورت میں فریقین کے درمیان نفع کی تقسیم اس وقت عمل میں لائی جائے جب معاملہ ختم ہو' معاملہ کے دوران درمیان میں نفع کی تقسیم جائز نہیں ہوتی کیونکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ درمیان کا نفع آخر میں نقصان کی صورت اختیار کرلیتا ہے' بہرحال عامل مضارب کا فائدہ اسی میں ہوتا ہے کہ معاملہ ختم ہونے پر بصورت نفع' نفع کی تقسیم ہو جبکہ کمپنی کے معاملہ میں ایسا نہیں ہوتا' اس میں بسا اوقات دورانِ معاملہ درمیانی مدت میں عبوری منافع کی تقسیم ہوتی ہے جو کمپنی کے قواعد وضوابط کے مطابق ضروری سمجھی جاتی ہے۔

مضاربت کا معاملہ دراصل انفرادی نوعیت کا معاملہ ہے جو دو افراد کے درمیان باہمی رضامندی اور خاص الفاظ سے طے پاتا ہے۔ کاروبار کے متعلق ضروری امور دونوں کی مرضی سے متعین ہوتے ہیں۔ عامل مضارب کو کاروبار میں ان شرائط کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے جو رب المال مقرر کرتا ہے مثلاً یہ کہ اس کو کیا مال کہاں سے خریدنا اور کہاں بیچنا اور فروخت کرنا چاہئے' جبکہ کمپنی کا معاملہ ایک اجتماعی نوعیت کا معاملہ ہے جس کے متعلق ضروری امور سب شرکاء کی مرضی سے طے نہیں ہوتے بلکہ کمپنی کے متعلق ملکی قوانین کے مطابق صرف کمپنی کے ڈائرکٹروں کی مرضی سے طے پاتے ہیں۔ حصص کے عام مالکان

کو صرف اپنے حصص کے نفع سے دلچسپی ہوتی ہے جو بازارِ حصص سے وہ نفع کی خاطر خرید لیتے ہیں۔ ان کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ کمپنی میں کس طرح کیا کام کیا جاتا ہے' وہ جائز حلال طریقہ سے ہوتا ہے یا ناجائز اور حرام طریقہ سے ہوتا ہے' اور نہ ان کے اور ڈائرکٹر حضرات کے درمیان یہ طے پاتا ہے کہ نفع کی صورت میں نفع کی تقسیم تناسب سے ہوگی بلکہ بہت سے حصہ داروں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کمپنی کو چلانے والے ڈائرکٹر کون اور کیسے لوگ ہیں اور وہ کاروبار میں حلال وحرام کی تمیز کو روا رکھتے اور اس کی پرواہ کرتے ہیں یا نہیں ؟ حالانکہ مضاربت میں ان امور کا جاننا اور ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ غرضیکہ گہری نظر سے تحقیقی جائزہ لیا جائے تو کمپنیوں کا معاملہ بہت سے اہم ضروری امور میں مضاربت کے معاملہ سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ مضاربت کے لئے صرف اتنا کافی نہیں کہ اس میں مال والے فریق کو بعض دفعہ نفع کی بجائے الٹا نقصان ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ مضاربت کے جواز کی صرف یہی وجہ نہیں کہ اس میں رب المال کو بعض مرتبہ بجائے نفع کے الٹا نقصان ہو جایا کرتا ہے' کیونکہ یہ وجہ تو جوئے میں بھی پائی جاتی ہے' لیکن وہ بالاتفاق حرام وناجائز ہے۔ لہٰذا یہ دیکھ کر کہ کمپنی کے حصص رکھنے والوں کو کبھی کبھی نفع کی بجائے نقصان ہوجایا کرتا ہے کمپنی کے معاملے کو مضاربت کی طرح جائز کہنا ایک بڑا مغالطہ ہے جس میں بعض اہلِ علم مبتلا ہیں۔ اللہ ان کو حقیقتِ حال کے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مروجہ کمپنیوں کا کاروبار جس طرح مضاربت کی تعریف میں نہیں آتا اسی طرح معاملۂ شرکت کی تعریف میں بھی نہیں آتا' کیونکہ جیسا کہ پہلے شرکت کی حقیقت کے بیان میں عرض کیا گیا کہ شرکت کی کوئی بھی قسم اور کوئی بھی شکل ہو اس میں ضروری ہے کہ ہر شریک کا کچھ نہ کچھ سرمایہ بھی موجود ہو اور کچھ نہ کچھ کام وعمل بھی پایا جاتا ہو' دراصل یہی وہ خصوصیت ہے جو شرکت کو مضاربت سے ممیّز وجدا کرتی ہے' اور چونکہ یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے کمپنیوں کے شیئرز اور حصص خرید رکھے ہوتے ہیں وہ سرمائے سے تو کمپنی کے کاروبار میں شریک ہوتے ہیں لیکن عمل وکام سے شریک نہیں ہوتے ان میں سے بہت سوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کمپنی کس طرح کیا کام کرتی کراتی ہے' وہ تو اس خیال سے حصص خرید کر رکھ لیتے ہیں کہ نرخ بڑھے گا تو وہ ان کو فروخت کرکے نفع

کمالیں گے' کام محنت کا تو ان کے ذہن میں کوئی تصور بھی نہیں ہوتا۔ اور پھر جو حصہ دار کمپنی میں کوئی کام کار کرتے ہیں باقاعدہ تنخواہ اور متعین اجرت پر کام کرتے ہیں' نفع کے ایک حصہ پر نہیں کرتے جیسا کہ معاملۂ شرکت کے شرکاء کرتے ہیں' کمپنی کے کاروبار میں جو لوگ مختلف قسم کے کام انجام دیتے ہیں وہ کبھی بھی اس لئے انجام نہیں دیتے کہ اس کے عوض ان کو نفع کا ایک حصہ ملے گا' لہٰذا اس پہلو سے اس کمپنی کا معاملہ' شرکت کے معاملہ سے ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔ اسی طرح چونکہ شرکۃ العنان کے معاملہ میں سرمائے اور عمل کی کمی بیشی کے باوجود سب شرکاء کی حیثیت برابر کی ہوتی اور ہر ایک کاروبار میں دوسرے کا وکیل ہوتا ہے اور کاروباری امور سب کے مشورہ سے طے پاتے ہیں' جبکہ ان میں سے کوئی چیز بھی کمپنی کے معاملہ میں موجود نہیں ہوتی' نہ سب شرکاء کاروبار میں ایک دوسرے کے وکیل وایجنٹ ہوتے ہیں' نہ پالیسی طے کرنے میں سب کی رائے شامل ہوتی ہے اور نہ ان کے درمیان بحیثیت شریک کے مساوات وبرابری ہوتی ہے۔ دراصل اس میں تمام تر اختیارات ڈائرکٹر صاحبان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جن کے سرمائے سے کمپنی قائم ہوتی اور وجود میں آتی ہے۔ ایک معمولی حصہ دار کی' جس نے چند حصص خرید لئے ہوتے ہیں' سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ اگر بعض دفعہ ایسے حصہ داروں کو جن کے کافی تعداد میں حصص ہوتے ہیں' بعض میٹنگوں میں شرکت کا موقع دیا جاتا ہے تو اس کا مقصد کمپنی کی کارگزاریوں سے ان کو آگاہ کرنا ہوتا ہے نہ کہ کمپنی کے امور و معاملات میں اصلاح اور رد و بدل کے لئے ان سے مشورہ اور تجاویز طلب کرنا۔ بہرحال کمپنی کے سب کچھ کرتا دھرتا اس کے ڈائرکٹر ہوتے ہیں' وہ اپنے مفادات کی خاطر جو چاہتے کرتے ہیں' لہٰذا کمپنی کے معاملہ کو معاملۂ شرکت سمجھنا اور کہنا کسی طرح صحیح ودرست نہیں ہو سکتا۔

مزید برآں جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کے مروجہ نظام میں اور بھی کئی ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو شریعتِ اسلامی کی رو سے جائز نہیں مثلاً ایک یہ کہ وہ عموماً سود پر بینکوں سے کاروبار کرتی ہیں اور اس میں کچھ حرج نہیں سمجھتیں' کیونکہ یہ دونوں ادارے نظامِ سرمایہ داری کے عناصرِ ترکیبی ہیں جس کی بنیاد ہی سود کے جواز پر قائم ہے۔ اسی طرح ان تجارتی کمپنیوں کا انشورنس کے ادارے سے بھی تعلق رہتا ہے۔ نیز ان کے اندر خرید وفروخت

کے ایسے طریقے پائے جاتے ہیں جو شریعتِ اسلامی کے مطابق نہیں ہوتے۔ نیز ان کمپنیوں کے جو کاغذی شیئرز و حصص بیچے خریدے جاتے ہیں ان کی خرید و فروخت بھی اسلامی اصول بیع و شراء کے خلاف ہے' کیونکہ اسلام کے نزدیک خرید و فروخت صرف ایسی چیزوں کی جائز ہوتی ہے جن کی ذات کے اندر انسان کی کسی طبعی و جبلی حاجت وضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہو اور جو مالِ حقیقی کی تعریف میں آتی ہوں' اور ظاہر ہے کہ کاغذ کے ان ٹکڑوں کی ذات کے اندر انسان کی کسی طبعی حاجت کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ کھانے پینے' پہننے پوشنے' رہنے سہنے وغیرہ کی اشیاء میں یہ نہیں آتے اور حقیقی طور پر یہ مال نہیں ہوتے' بلکہ قانونی اور حکمی طور پر مال ہوتے ہیں جس طرح کہ حکومت کے جاری کردہ کرنسی نوٹ' اگرچہ حکومت کے جاری کردہ نوٹوں کی حیثیت کمپنیوں کے شیئرز کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بہتر و مستحکم ہوتی ہے کرنسی نوٹوں کے ذریعے ہر چیز ہر جگہ سے خریدی جا سکتی ہے جبکہ کمپنی شیئرز کی خرید و فروخت' شیئرز مارکیٹ میں صرف نقد کے عوض ہوتی ہے' عام بازار میں آپ ان کے عوض کوئی چیز خرید نہیں سکتے' جس طرح کہ کرنسی نوٹوں کے عوض خرید سکتے ہیں۔ کرنسی نوٹوں کی حیثیت اپنے مقصدِ وجود کے لحاظ سے ہمیشہ ثمن کی ہوتی ہے یعنی جس کے عوض کوئی چیز خریدی جاتی ہے' کبھی بھی مبیع کی حیثیت نہیں ہوتی یعنی جو چیز بیچی خریدی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوٹوں کی نوٹوں کے عوض کمی بیشی کے ساتھ ازروئے شریعت خرید و فروخت جائز نہیں ہوتی' کیونکہ جو چیز اپنی وضع کے لحاظ سے ثمن ہے اس کو مبیع بنانا قلبِ ماہیت ہے جس کا عقلی طور پر جواز نہیں۔ کرنسی نوٹوں کی خرید و فروخت کے درست نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنی اصل وضع کے لحاظ سے معاملۂ بیع و شراء اور خرید و فروخت کا تعلق مالِ حقیقی سے ہے جس کی انسانوں کو اپنی حیات وبقا اور نشو و نما کے لئے ضرورت و حاجت ہوتی اور جس کے تبادلے پر معاشرے کے قیام و استمرار کا دارومدار ہوتا ہے اور چونکہ کرنسی نوٹ حقیقی مال نہیں بلکہ حکمی مال ہوتے ہیں لہٰذا ان کی خرید و فروخت' معاملۂ خرید و فروخت کی اصل وضع اور غرض و مقصد کے خلاف ٹھہرتی اور غلط و باطل قرار پاتی ہے۔

اسلام میں معاملۂ بیع و شراء کی جو مشروعیت ہے وہ اس کی اصل وضع اور مقصدیت

کے لحاظ سے ہے لہٰذا حقیقی مال کی خرید و فروخت اسلام کے نزدیک درست اور حکمی مال کی خرید و فروخت نادرست و ناجائز ٹھہرتی ہے۔ کمپنیوں کے کاغذی شیئرز و حصص کی کوئی حیثیت ہو سکتی ہے تو زیادہ سے زیادہ حکمی مال ہی کی ہو سکتی ہے لہٰذا دلیل مذکور کی رو سے ان کی خرید و فروخت باطل و ناجائز قرار پاتی ہے۔ مزید برآں کمپنیوں کے حصص و شیئرز کی قیمتوں میں جو اتار و چڑھاؤ ہوتا ہے وہ عام طور پر طلب و رسد کے قدرتی طریقہ سے نہیں ہوتا بلکہ سٹے بازی وغیرہ کے مصنوعی طریقوں سے ہوتا ہے لہٰذا اس پہلو سے بھی ان کی خرید و فروخت کا معاملہ درست نہیں ہوتا۔

اسی طور سے کمپنیوں کے مروجہ نظام میں ایک اور چیز جو حقیقتِ واقعہ کے خلاف اور شرعی و عقلی طور پر بالکل غلط و باطل ہے وہ یہ کہ کمپنی کی ایسی قانونی شخصیت مانی جاتی ہے جس کے لئے ملکیت وغیرہ کی شکل میں کچھ حقوق بھی ہوتے اور جس پر قرضوں وغیرہ کی شکل میں کچھ واجبات بھی ہوتے ہیں۔ کمپنی کے لئے اس طرح کی شخصیت تجویز اور تسلیم کرنا اس وجہ سے غلط اور باطل ہے کہ یہ حقیقتِ واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر جماعت اور اجتماعی ادارے کی طرح کمپنی کی بھی ایک اعتباری شخصیت ہوتی ہے جس کا وجود ذہن میں ہوتا ہے خارج میں نہیں ہوتا۔ کمپنی کی اس اعتباری شخصیت جس کا وجود ذہن میں ہوتا ہے' کے متعلق حقوق و واجبات کا خیال بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ حقوق و واجبات کا تعلق ایسی حقیقی شخصیت سے ہوتا ہے جو خارج میں اپنا مستقل وجود رکھتی اور ایک زندہ' باشعور اور بااختیار شخصیت ہو۔ دراصل ایسی ہی شخصیت کسی چیز کی مالک بھی ہو سکتی ہے اور کسی ادائیگی کی ذمہ دار بھی قرار پا سکتی ہے' کیونکہ ثبوت اور حصولِ ملکیت کے لئے جن اسباب کا وجود ضروری ہوتا ہے وہ بھی ایسی ہی شخصیت کے ذریعے وجود میں آتے ہیں اور ملکیت کے مفہوم میں انتفاع و استفادے کا جو تصور ہے اس کی قدرت اور صلاحیت بھی ایسی ہی زندہ اور خارج میں موجود شخصیت کے اندر پائی جاتی ہے' اسی طرح اپنے اختیار کے ساتھ کسی ذمہ داری کو قبول کرنے اور ادا کرنے کی صفت و صلاحیت بھی ایک ایسی ہی حقیقی اور طبعی شخصیت میں موجود ہوتی ہے جو خارج میں اپنا مستقل وجود رکھنے کے ساتھ زندہ اور باشعور ہوتی ہے۔ غرضیکہ کمپنی کی اعتباری شخصیت نہ کسی چیز کے مالک ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ کسی ذمہ داری کو

قبول اور ادا کرنے کی اس کے اندر کوئی قدرت و صلاحیت ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کسی کمپنی کے متعلق یہ کہا جائے کہ فلاں چیز اس کی ملکیت یا اس پر فلاں چیز کے ادا کرنے کی ذمہ داری ہے تو حقیقتِ واقعہ کے لحاظ سے اس کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز ان بہت سے افراد کی ملکیت ہے جنہوں نے خاص اغراض ومقاصد کے تحت آپس میں نظم و اتحاد کیا اور شناخت و پہچان کے لئے اپنی تنظیم کا ایک خاص نام رکھا تاکہ جب ان بہت سے افراد کے متعلق، جن کی تعداد سینکڑوں بھی ہو سکتی ہے، کوئی بات کہنی ہو تو بجائے ان سب کا فرداً فرداً نام لینے کے، جس میں ظاہر ہے کہ طوالت بھی ہے اور زحمت بھی، صرف کمپنی کے اس مخصوص نام سے وہ بات کہہ دی جائے۔ مثلاً جب یہ کہنا ہو کہ فلاں چیز ان مثلاً سو افراد کی ملکیت ہے یا یہ کہ فلاں ذمہ داری ان سو افراد کے ذمہ پر ہے جن کے منظم مجموعے کا نام کمپنی ہے تو اس کا آسان طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں چیز کمپنی کی ملکیت اور فلاں ذمہ داری کمپنی کی ذمہ داری ہے۔ تو گویا کمپنی کی طرف ملکیت اور ذمہ داری کی نسبت حقیقی طور پر نہیں بلکہ مجازی طور پر ہوتی ہے۔ حقیقی طور پر ملکیت اور ذمہ داری کی نسبت شرکاءِ کمپنی کی طرف ہوتی ہے جو خارج میں ان اوصاف کے ساتھ موجود ہوتے ہیں جن پر ملکیت اور ذمہ داری کا دار و مدار ہے۔ فقہِ اسلامی میں وقف اور بیت المال کی طرف ملکیت اور ذمہ داری کی جو نسبت ہے اس سے بھی مراد وہ زندہ لوگ ہیں جن سے وقف اور بیت المال کا تعلق ہوتا ہے۔ وقف کی ملکیت ان لوگوں کی ملکیت ہوتی ہے جن کے استفادہ کے لئے وقف قائم کیا جاتا ہے اور بیت المال کی ملکیت ان لوگوں کی ملکیت ہوتی ہے جن کے لئے بیت المال کا مال مخصوص ہوتا ہے۔ اسی طرح وقف کی ذمہ داری وقف کے متولی اور بیت المال کی ذمہ داری امین اور ناظرِ بیت المال کی ذمہ داری ہوتی ہے جس کو امیرِ مملکت مقرر کرتا ہے۔

مطلب یہ کہ کمپنیوں سے متعلق جو قوانین ہیں وہ کمپنی کی ایسی قانونی شخصیت قرار دیتے ہیں جو حقیقی معنوں میں مالک بھی ہوتی ہے اور ذمہ دار بھی۔ چنانچہ بعض دفعہ جب کوئی کمپنی مسلسل خساروں کی وجہ سے بیٹھ جاتی اور اس کا ختم کرنا ضروری ہوجاتا ہے اور کمپنی کے اثاثہ جات اس کے ذمے واجبات کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں ہوتے بلکہ سب کچھ نیلام کردینے کے بعد بھی کمپنی کے ذمے قرض کی شکل میں کچھ واجبات رہ جاتے ہیں

تو اس حالت میں یہ کہہ کر واجبات کو ختم کر دیا جاتا ہے کہ جس کے ذمے واجبات تھے وہ دیوالیہ ہو کر ختم ہو گئی' لہٰذا واجبات بھی ختم ہو گئے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا قانون ایسا بھی ہے جو کمپنی کے شرکاء کی ذمہ داری کو کمپنی میں لگے ہوئے سرمائے کی حد تک محدود ٹھہراتا ہے۔ یہ دونوں قانون اسلام کی رو سے اس لئے باطل ہیں کہ ان کے مطابق بعض حقدار جن کے کمپنی کے ذمے واجبات ہوتے ہیں اپنے واجبی حق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک مذکورہ صورت میں کمپنی کے ذمے واجبات کی ادائیگی کمپنی کے ان ڈائرکٹر حضرات پر عائد ہوتی ہے جو کمپنی کے نام پر قرضے لیتے اور تمام امور کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ مذکورہ صورت میں ان پر لازم ہوتا کہ وہ اپنے دوسرے ذاتی مال سے واجبات ادا کریں تاکہ حقدار کی حق تلفی واقع نہ ہو۔

اسلام میں کسی کاروباری شخص کے دیوالیہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز صحیح نہیں کہ اس کے ذمے دوسروں کے جو قرضے تھے وہ افلاس و ناداری کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے ساقط ہو گئے' بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جب بھی ادائیگی کے قابل ہو وہ ضرور ادائیگی کرے۔ قرآن مجید میں ارشادِ رب العزت ہے: **وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** (البقرہ: ۲۸۰) یعنی اگر وہ مقروض تنگ دست ہو' فوراً قرض ادا نہ کر سکتا ہو تو اس کو مہلت دی جائے تاآنکہ وہ آسانی کے ساتھ ادا کرنے کے قابل ہو جائے' اور تمہارا صدقہ کر دینا یعنی اس کو معاف کر دینا تمہارے لئے بہت بہتر ہے اگر تم اس کا علم رکھتے ہو۔

بہرحال قرآن مجید کی اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مفلس و تنگ دست ہونے کی وجہ سے مقروض کے ذمے سے قرض ساقط نہیں ہوتا' زندگی میں جب بھی ادا کرنے کے قابل ہو اس پر اس کا ادا کرنا لازم ہوتا ہے' بنابریں کمپنی کے ذمہ دار شرکاء یعنی ڈائرکٹروں پر لازم ہوتا ہے کہ وہ کمپنی کے ذمے واجبات کو ضرور ادا کریں۔

واضح رہے کہ کمپنیوں کے کاروبار کے متعلق بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ کاروبار کا یہ تجارتی ادارہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغربی ممالک میں ایجاد اور تجویز ہوا جہاں سرمایہ دارانہ معاشی نظام رائج تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں جزوی تغیر و تبدل ہوتے رہے حتی کہ ۱۹۴۸ء میں ان سے متعلق بعض قوانین مکمل ہوئے۔ لہٰذا ظاہر

ہے کہ اس ادارے کی شرعی حیثیت کے متعلق قرآن' حدیث اور کتبِ فقہ میں صراحت کے ساتھ کوئی حکم مذکور نہیں ہو سکتا' لیکن قرآن وحدیث میں ایسے اصول و مبادی ضرور موجود ہیں جن کی روشنی میں اس کاروباری ادارے کی شرعی حیثیت کا تعین کیا جا سکتا ہے جس کا سب سے بہتر طریقہ اجتماعی اجتہاد کا طریقہ ہے۔ محقق علماء کی ایک جماعت اس کام کو اجتہاد کے ذریعے بخوبی انجام دے سکتی ہے!---- **واللّٰہُ هو الموفقُ والمُعین**

صدرِ مؤسّس مرکزی انجمن خدّام القرآن اور امیر تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں عملی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع اِلیَ القرآن

کا منظر و پس منظر

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلّد ۸۰ روپے ■ غیر مجلّد ۶۰ روپے